سائرہ رضا
سوال

"بہت بری بات ہے بھابھی گل! ہم اتنی دور سے چل کر آگئے اور آپ ہمیں ٹائم ٹیبل سمجھا رہی ہیں۔" چھوٹی نند پشمینہ کھنکتے لہجے میں اسے غیرت دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"میں ہر کام طریقے سے کرنے کی عادی ہوں پیاری پشمینہ!" اس نے ذرا اثر نہ لیا۔

"ہائے اللہ! میری اور دادا (بڑا بھائی) کی شادی طریقے سے باہر ہے۔ آپ دیکھ رہی ہیں آپا گل!" پشمینہ نے بڑی بہن کو شکایت لگائی۔

"دیکھ رہی ہوں۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ مجھے بھی دیر تک بازاروں میں رہنا پسند نہیں ہے۔ وزیرہ ٹھیک کہتی ہے۔" گوری چٹی سنہری آنکھوں والی آپا گل کو بھابھی کی کوئی بات بری لگتی نہ تھی۔ سلیقہ شعار پڑھی لکھی خوب صورت وزیرہ ان کی ہی پسند تھی۔ جو بعد میں سب کی پسند بن گئی۔

"سو رو! خالہ صحیح کہتی ہیں اتنی صبح تو اسکول جاتے ہیں یا دفتر۔ کم از کم شاپنگ پر نہیں جاتے۔" آپا گل کی پندرہ سالہ بیٹی کی جانب سے نکتہ اعتراض آیا۔

"اور جانے کی بھی خیر ہے مگر ڈھائی بجے سے پانچ منٹ پہلے واپسی کیسے ممکن ہوگی۔"

"اس کی فکر تم مت کرو ناممکن کو ممکن بنانا ہمیں آتا ہے۔ تم یہ چائے لو اور ساتھ اخروٹ کا حلوہ۔"

وزیرہ نے ٹرے اس کے عین سامنے رکھ دی۔

چائے اور حلوے کی خوشبو نتھنوں سے ٹکرائی تو زیر بحث موضوع سے توجہ ہٹ گئی۔ وزیرہ اوون سے کباب بھی نکال لائی۔ آتش دان میں کوئلے چیخ رہے تھے۔ کمرا گرم تھا۔ مگر وہ ٹھنڈے ہاتھوں کے باعث کپکپا گئی تھی۔ سی سی کرتی گرم کمبل میں گھس گئی۔

"اب اتنی بھی سردی نہیں ہے بھابھی گل!" پشمینہ نے چھیڑا۔

"ہاں ہاں بالکل نہیں ہے۔ بالکل بھی نہیں ہے۔" وزیرہ نے اختلاف سے گریز کیا اور ساتھ ہی ذرا سا آگے ہو کر اپنے دونوں ہاتھ پشمینہ کے گالوں پر چپکا دیے۔ وہ کرنٹ کھا کر پیچھے سرکی۔

وزیرہ نے جب گردن پکڑی تو پشمینہ چیخیں مارتی پیچھے کو سرکی۔ وزیرہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے اور آگے ہوئی۔

"اب میں یہ ہاتھ تمہارے پیٹ پر لگانے والی ہوں کیونکہ سردی بالکل نہیں ہے۔"

"بچائیں آپا گل! بچائیں۔ بھابھی گل ظالم ہو گئی ہیں۔" پشمینہ کو اب سردی سے زیادہ گدگدی کی فکر ہوئی۔ اسے گدگدی کے خیال سے ہی ہنسی آنے لگی تھی۔ وزیرہ اور چھوٹی فائزہ پہلے ہی ہنس رہی تھی۔ وزیرہ اپنی ہنسی ہی سے تھک گئی۔ جسم میں لہو بھی گرم ہو گیا۔ آپا گل بھی ہنس رہی تھیں۔

"بھابھی ظالم نہیں ہوئی۔ نند گرم کمرے کی گرم رضائی میں بیٹھ کر بے حس ہو گئی ہے۔ پتا ہے لائٹ نہیں تھی۔ گیزر کام نہیں کر رہا اور تلکوں سے گویا برف نکل رہی ہے۔ انگلیاں اکڑ گئیں میری۔" وہ ہاتھ آپس میں رگڑنے لگی۔

"آپ دیکھ رہی ہیں آپا گل! بھابھی گل نے ہمیں جتا دیا کہ ہمارے لیے چائے بنانے سے انہیں کتنی سردی لگی ہے۔ حالانکہ ہمیں آئے ابھی ڈیڑھ گھنٹہ بھی نہیں ہوا۔ توبہ توبہ۔" پشمینہ کی آنکھیں شرارت سے بھری ہوئی تھیں۔

"اور آپ دیکھ رہی ہیں آپا گل! کہ اس ڈیڑھ گھنٹے میں اس نے کتنی بار میری شکایت لگائی ہے اور فساد ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ ایسی فتنہ پرور نند۔ توبہ توبہ۔"

"اللہ ماہی! آپ کتنی اچھی باتیں کرتی ہیں۔" فائزہ نے یکدم اس کے ہاتھوں کو عقیدت مندی سے تھام لیا۔ پشمینہ نے گھور کر بھانجی کو دیکھا پھر آپا گل کو جو بڑی محبت سے وزیرہ کو دیکھ رہی تھیں۔ اور چہرے سے یہ بھی پتا لگتا تھا کہ وزیرہ کے خیالات سے متفق ہیں۔ وزیرہ بے نیازی سے چھت کے پنکھے کو گھور رہی تھی۔ جیسے گردو پیش سے بے خبر ہو۔

پشمینہ نے ایک مکا بنا کر وزیرہ کے شانے پر ٹھوک دیا۔ وزیرہ زور سے ہنس دی۔

"اور یہ "دیکھ رہی ہیں آپا گل!" والی حرکتیں چھوڑ دو۔ پتا لگے۔ نئے نئے دولہا کی ہر بات پر تم صدائیں لگاؤ۔ دیکھ رہی ہیں آپا گل۔ اب آپا گل دیکھنے کے لیے کراچی تک کی دوڑیں لگائیں گی کیا؟"

پشمینہ جھینپ کر رہ گئی۔ فائزہ نے قہقہہ لگایا جبکہ آپا گل نے بمشکل چائے کا گھونٹ حلق سے اتارا۔ اور پھر ایک فلک شگاف قہقہہ لگا کر بولیں۔

"اللہ کی قسم میں خود بھی دو تین دن پہلے یہی سوچ رہی تھی۔"

پشمینہ شرمانے کے بعد اب خفا ہونے کا تاثر دینے کے لیے ذرا منہ موڑ گئی۔ وزیرہ نے جلدی سے پلیٹ بنا کر چائے کا کپ دیا۔

"جلدی جلدی چائے ختم کرو پھر پروگرام بھی تو سیٹ کرنا ہے۔ یہ تو بتایا نہیں کہ کتنی شاپنگ کرنی ہے کتنی ہو گئی ہے۔ بس باتیں ہی باتیں۔"

پشمینہ نے ناراض رہنے کا تاثر برقرار رکھا۔ آپا گل شروع ہو گئیں۔ وزیرہ بھی سنجیدہ ہوئی۔

"پہلے تو گرم کپڑوں کی خریداری کی فکر تھی مگر آغا جی کا فون آ گیا۔ انہوں نے کہا بے کار ہوں گے سارے کپڑے۔ کراچی میں لوگ فل پنکھا چلا کر سردی سردی کرتے ہیں۔ عورتیں لان کے سوٹ پر گرم شال لیتی ہیں۔ میں نے تو یہ بات سنتے ہی سارے گرم کپڑے کاٹ دیے لسٹ میں سے۔ کوئی سستے ہوتے ہیں گرم سوٹ اور سوئٹر شالیں۔"

وزیرہ سر ہلانے لگی۔ فائزہ کا چہرہ تمتمانے لگا۔ اسے کچھ یاد آ گیا تھا۔

"جامنی رنگ کا شرارہ لیا ہے آغا جی لوگوں نے اور آسمانی رنگ کا پشواز سوٹ بھی۔ اور تین تو کڑھائی والے پلازو ہیں چوڑی دار پاجامے بھی۔ اور ماموں نے مجھے نہیں بنانے دیے۔" وہ افسردہ بھی ہو گئی۔

"پشمینہ کو کراچی میں پہننے ہیں وہ سب کپڑے اور تم نے گاؤں میں۔ جیسا دیس ویسا بھیس کرنا چاہیے فائزہ۔"

فائزہ چپ ہو گئی۔ ماں بھی اتنے دن سے یہی سمجھا رہی تھی۔

تھوڑی دیر تک ناراض رہنے کے بعد پشمینہ بھی گفتگو میں شامل ہو گئی۔ اسے اس ایک ہفتے کے اندر ساری کی ساری شاپنگ کرنی تھی۔ آپا گل اور پشمینہ وزیرہ کے شوہر سعد اللہ کی چچا زاد بہنیں تھیں۔ سعد اللہ اکلوتے تھے اور جوائنٹ فیملی سسٹم کی بنا پر ان دونوں کی اہمیت سگی نندوں سے بھی بڑھ کر تھی۔ سعد اللہ آپا گل کا ماؤں جیسا احترام کرتے اور پشمینہ کے لاڈ بیٹیوں والے تھے کہ خود اپنے دو بیٹے تھے۔ بیٹی دانیہ تو کوئی چھ سال پہلے آئی تھی۔

وزیرہ اور سعد اللہ پشاور شہر میں رہائش پذیر تھے بوجوہ ملازمت جبکہ باقی سارا خاندان گاؤں میں تھا۔ پشمینہ اور دادا (پشمینہ سے بڑے بھائی) کی شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں ان تینوں کی آمد ہوئی تھی۔ وزیرہ خود بھی بہت پر جوش تھی۔ اس کی اپنی فیملی اسلام آباد میں تھی اور وہ سب چھٹیوں میں آیا کرتے۔ ادھر سسرال والے بھی گاؤں سے بہت مجبوری کے عالم میں نکلتے تھے۔

وزیرہ کو شاپنگ کا شوق تھا۔ خواہ اپنے لیے۔۔۔ یا کسی کے لیے۔۔۔ مگر اس شوق و جوش سے پرے۔۔۔ اس کے کچھ اصول و ضوابط تھے۔ جو اب پشمینہ اور فائزہ کو ناگوار گزر رہے تھے۔ آپا گل بھی اعتراض تو کرتی تھیں مگر پھر کچھ سوچ کر چپ ہو جاتیں۔

اور کڑے اصول و ضوابط کے پیچھے ظاہر ہے کہ مضبوط جواز تھے۔ بہت سا وقت گزر جانے کے بعد بھی وزیرہ ان سب چیزوں سے ابھر نہیں سکی تھی۔ پڑھی لکھی تھی۔ بہت معقول شخصیت کی مالک تھی۔ ہر رشتے کو نبھانے کے معاملے میں آئیڈیل کہی جا سکتی تھی۔

مگر ایک وہم جو اس کی زندگی کو شاید گھن کی طرح چاٹ رہا تھا کہ اس کے بچوں کو کچھ ہو نہ جائے۔ وہ اس سے ابھر نہیں پائی تھی۔ اتنا وقت گزر جانے کے بعد کچھ ٹھہراؤ تو آ گیا تھا۔ مگر وہ اپنے اندر یقین اور بھروسا نہیں پال سکی تھی۔

اٹھارہ اکتوبر کے زلزلے میں وزیرہ کے خاندان کا کوئی جانی اور مالی نقصان نہیں ہوا تھا مگر وزیرہ نے ذہنی نقصان کو جھیلا تھا اور اب تک اسی کے زیر اثر زندگی گزار رہی تھی۔

ان دنوں سعد اللہ کی پوسٹنگ اسلام آباد میں تھی جب صبح زمین نے ہلکی سی کروٹ لی اور زمین کے اوپر دھری ہر شے تہس نہس ہو گئی۔ وزیرہ کچن میں تھی۔ سعد اللہ دفتر جا چکے تھے۔ دونوں بیٹے پانچ سالہ علی اور چھ سالہ ولی سو رہے تھے۔ اسے بچوں کے اٹھنے سے پہلے ان کے لیے ناشتا تیار کرنا تھا۔

اس نے چمچوں کے اسٹینڈ پر ہلتے چمچے دیکھے۔ دیوار کے سہارے کھڑی کی گئی اسٹیل کی چند پلیٹیں زمین پر گری تھیں۔ کچن کیبنٹ کے اندر بہت سے برتن آپس میں ٹکرائے۔ اسے اپنا سر چکراتا محسوس ہوا تھا۔ اس نے سر کو تھاما۔ کیوں بھلا؟ وہ روزے سے تھی مگر ٹھنڈے روزے اور ابھی تو صبح ہی ہوئی تو۔۔۔

لیکن اس معمولی سے اچنبھے کے بعد اس پر یک دم حقیقت آشکار ہوئی۔ زلزلہ تو سر نہیں چکرا رہا تھا۔ زلزلہ تھا۔

وہ بجلی کی سی تیزی مڑی تھی۔ اس کے بچے۔ بے خبر پر سکون نیند سوتے بچے۔ وہ دروازے کی جانب لپکی تھی اور اگلا قدم باہر ہونے کو تھا۔ جب کچن کے سامنے والی راہداری کی دیوار اس کے سامنے ریت کی دیوار کی طرح ڈھنے لگی اور ساتھ ہی چھت نے گر کے آگے جانے کا راستہ بند کر دیا۔ دیوار ریت کی طرح گری ضرور تھی مگر وہ ریت کے ذرات میں نہیں بدلی تھی۔ وہ پتھر اور اینٹوں کے ڈھیر کی صورت تھی۔ وہ اسے پھلانگ لیتی شاید۔ مگر راہداری سے نکلنے کا واحد راستہ چھت سے گر کے یوں بند ہوا تھا جیسے کسی غار کا دہانہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتا ہے۔

وہ کچن کے دروازے کے ستون کے نیچے تھی اور مضبوط ستون جوں کا توں تھا اس کے پیچھے ایک اور دھماکا ہوا تھا کچن کے سامنے والی دیوار میں دراڑیں پڑی تھیں اور کیبنٹس کا پورا چوکھٹا زمین بوس ہو گیا تھا۔

تمام برتن نیچے گرے تھے اور ان میں سے بیشتر چکنا چور ہو گئے تھے۔ اسے چیخنے چلانے کا موقع نہیں ملا تھا کہ ابھی تو وہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکی تھی کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔

وہ بہت آرام سے کھڑی تھی۔ گرد و غبار کا سرمئی، گلے کو چھیرتا دھواں، اس کی ناک اور حلق تک سب میں مٹی گھس گئی تھی۔ اس کے کانوں میں شیشے ٹوٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور چیزیں گرنے کی آوازیں۔ صورت حال خراب تھی، سمجھ میں آ گیا۔ کتنی زیادہ خراب ہے۔ ولی کی آواز سنتے ہی یقین آ گیا اور یہ بھی کہ کتنی بری ہونے والی تھی۔

"مما۔ مما جی۔"

زلزلے نے اس کے جسم کو کچھ نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ مگر زلزلے نے اس کے دل اور روح کو نوچ لیا تھا۔ اسی پل اگا دوسری آواز علی کے رونے کی تھی وہ اسے پکار رہا تھا۔ کمرے ہی سے۔ وہ بند راہداری کے دوسری طرف آ کھڑا ہوا تھا۔

وہ پھنسی ہوئی تھی مگر کونے سے لگی ہوئی نہیں کھڑی تھی۔ جگہ بدل سکتی تھی۔ چل پھر سکتی تھی۔ اس کے چہرے اور لباس اور بالوں پر اتنی مٹی تھی کہ وہ بھوت نظر آتی۔ وہ خود کو جھٹکنا بھول کر تیزی سے گری چھت کے ملبے تک آئی تھی۔ ننگے پیر تھی اور پیروں میں پتھر چبھے تھے۔ ملبہ اوپر تک تھا اور اتنا راستہ نہ تھا کہ وہ نکل جاتی نہ اتنی ہمت تھی کہ ملبہ ہٹا سکتی مگر اتنی جھریاں ضرور تھیں کہ اسے بری طرح روتا حیران پریشان ولی نظر آ رہا تھا۔ اس نے بہت تیزی سے ہاتھوں سے پتھر ہٹا کر جھری کو بڑا کرنے کی کوشش کی پھر اس سے ہونٹ جوڑ کر پکارا۔

"ولی۔ ولی! ادھر دیکھو! مما ادھر ہیں۔"

ولی نے حیرت سے آواز سنی پھر گھوم پھر کے دائیں بائیں دیکھا۔ ماں کی آواز تو آئی تھی۔ ماں نظر نہیں آئی تھی۔

"ولی!" وہ پوری طاقت سے چلائی تو گرد و غبار سانس کے ساتھ اندر تک چلا گیا۔ اسے کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔

ولی کو کھانسی نے متوجہ کیا اسے ماں نظر آ گئی۔ وہ تیر کی تیزی سے دوسری جانب جھری کے نزدیک آ گیا۔ کھانستی ماں ایسے کیوں بیٹھی تھی۔ اس نے چھوٹی نرم انگلیاں اندر ڈالیں۔

"مما! آپ ادھر کیوں بیٹھی ہیں۔ مما جی۔ مما جی! ہمارا گھر کس نے توڑ دیا۔ مما جی باہر آؤ۔"

"میں باہر نہیں آ سکتی ولی!" وہ کھانسی پر قابو پا کر نزدیک آئی۔

"کیوں؟"

"بس ابھی نہیں۔" وزیرہ نے سر اٹھا کر کنکریٹ کے ٹوٹے ڈھیر کو دیکھا۔ وہ سو سال لگا کر بھی اس سب کو ایک انچ بھی نہیں سرکا سکتی۔ اس نے ایک اور جھری تلاش کرنے کی کوشش کی۔ جو اوپر جا کر مل گئی۔ ذرا بڑی مگر یہاں سے ولی دکھائی نہیں دیتا۔ مگر اسے یہ نظر آ گیا کہ سامنے ٹی وی زمین بوس تھا اور کھڑکی کے شیشے ٹوٹے تھے اور کانچ زمین پر پڑے تھے۔ کارنر اسٹینڈ سے تمام ڈیکوریشن پیس گر چکے تھے اور۔۔۔

"مما باہر آؤ۔ مما جی!"

وزیرہ لپک کر پچھلی جھری کے پاس جھک گئی۔ ولی ایک آنکھ لگائے اسے دیکھ رہا تھا اور آنکھ بھیگی تھی۔ وزیرہ کا دل مسل گیا۔ اسے یک دم احساس ہوا بہت برا ہو چکا ہے۔ وہ ایک مصیبت میں گرفتار ہو چکی ہے۔ اور یہ زلزلہ ہی تھا نا۔ وہ زلزلے کی ہیبت کو کبھی فراموش نہ کرتی اور ایک عام انسان کی طرح چیخ و پکار مچانا شروع کر دیتی۔ مدد کی صدائیں لگاتی، روتی کرلاتی مگر ولی کی آواز نے اسے یہ سب کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

انسان خوف کھاتا ہے۔ رد عمل کا اظہار کرتا ہے مگر ولی کی پکار نے اسے انسان سے ہٹا کر صرف ماں کر دیا تھا۔ وہ اپنی بپتا بھول کر ہر شے کو فراموش کرے بس اس جھری کے پاس آ رکی تھی۔

وہ انسان نہیں رہی تھی فقط ماں تھی اور ماؤں کی فکریں۔

"مما! باہر آئیں ناں۔"

"میں باہر نہیں آ سکتی ولی! میں۔۔۔" وزیرہ رونے لگی۔

"تو مجھے اندر بلا لیں مما!" وہ بولا۔ دوسری طرف علی کے رونے کی آواز میں شدت آ گئی۔ اسے آنکھ کھلتے ہی فیڈر کی عادت تھی۔ پانچ سال کا ہونے کے باوجود صبح کا آغاز فیڈر سے ہوتا تھا۔ وزیرہ کے ہوش اڑ گئے۔

اسے ساتھ ہی خیال آیا۔ وہ اوپر والی چوڑی جھری سے فیڈر باہر پھینک سکتی ہے۔ وہ تیزی سے اٹھی۔ اونچے نیچے پتھروں کا ڈھیر تھا۔ پورے کچن کے فرش پر مٹی اور ٹوٹے برتنوں کی کرچیاں تھیں۔ اس کے بنائے ہوئے ناشتے پر مٹی کی تہ جم چکی تھی۔ فیڈر تیار کرنے میں اسے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ وہ گرتی پڑتی دوبارہ سب سے اونچے ڈھیر پر چڑھی۔ اس نے فیڈر نیچے پھینکا پھر تیر کی سی تیزی سے نیچے آئی۔ ولی حیرانی سے فیڈر کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ فیڈر علی کو دو ولی! علی کے منہ میں دے دو۔ جلدی جاؤ اچھے بیٹے۔" ولی ہنوز کھڑا تھا جیسے کچھ سمجھ نہیں پا رہا۔

"بھائی بھوکا ہے ولی!" وہ تڑپی۔

"مجھے بھی بھوک لگی ہے مما!"

"تم بھائی کو دے کر آؤ۔ میں تمہیں بھی ناشتا دوں گی۔" وہ تیار تھی۔

"یہیں سے دیں گی سوراخ سے۔" بچے کو دلچسپی محسوس ہوئی۔

"ہاں یہیں سے دوں گی۔" وزیرہ کو شدید کھانسی ہو رہی تھی۔ وہ روزے سے تھی۔

"اچھا پھر جلدی سے دے دیں۔"

"تم بھائی کے پاس جا کر بیٹھو ولی! میں تمہیں آواز دے دوں گی۔"

"نہیں۔ میں یہیں رہوں گا۔" وزیرہ نے اس بحث میں الجھنے کے بجائے ناشتا دینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے تلا ہوا انڈا بریڈ مکھن ایک تھیلی میں کر کے جھری کے سرے پر رکھ اسے جھری سے بڑھا دیا۔ پلیٹ بھی نکال دی۔

چھ سالہ بچے کے لیے یہ سب دلچسپی سے بھرپور تھا۔ وہ وہیں پھسکڑا مار کے بیٹھ گیا۔ اور وزیرہ جھری کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ اب ذرا تحمل سے سانس بحال کرتے ہوئے صورت حال پر غور کرنے لگی۔

تو یہ زلزلہ تھا۔ اور اگر زلزلہ ہے تو سارے اسلام آباد میں ہی برپا ہوا ہوگا۔ تو یقیناً" سعد اللہ بھی بے خبر نہ ہوں گے اور وہ جلد ان کا حال جاننے کے لیے آئیں گے بلکہ آتے ہی ہوں گے۔ تو پھر یہ کہ وزیرہ سعد اللہ تمہیں تحمل سے بیٹھ کر انتظار کرنا ہوگا۔ اور دعا کرنی ہوگی کہ سب ٹھیک رہے۔ سعد اللہ بہت ہی دیر سے آئیں تو ڈیڑھ گھنٹہ لگ جائے گا۔ اور وہ بچوں کو ناشتا دے چکی ہے۔ اور بچے اسے اور وہ بچوں کو دیکھ سکتی ہے۔

سعد اللہ کے احساس ذمہ داری نے وزیرہ کے دل کو سکون دیا۔ علی فیڈر خاموشی سے انجوائے کرتا تھا۔ ولی دونوں ہاتھوں سے نوالے لے رہا تھا۔ اور وہ اپنے گھر میں پیدا ہو جانے والے کھنڈر پر چڑھ کر بیٹھ گئی تھی۔ تباہی مگر سکون اور پھر وہ رونے لگی اور روتی چلی گئی۔ بیٹھے بٹھائے صبح سویرے یہ کیسی مصیبت پڑی' یہ کیسی آفت' کیسی ناگہانی تھی۔ وہ سوچنے لگی یہ کیسا زلزلہ ہے جس نے اتنے مضبوط گھر کے درمیان والی دیوار کو ایسے گرا دیا جیسے برادہ۔ اس نے زلزلے کے جھٹکوں کا زندگی میں دو ایک بار پہلے بھی تجربہ کیا تھا۔ اتنا کہ ٹیبل پر پڑا گلاس لرز اٹھا یا الماری کے اندر ہینگرز آپس میں ٹکرانے لگے۔ بس۔ یا پھر بعض اوقات بس اتنا سا کہ خبروں میں سنا اور سوچا۔ اچھا۔ کب۔ پتا ہی نہیں چلا۔

اور اس بار بھلے سے وہ بے خبر تھی کہ کتنی بڑی تباہی ہو چکی ہے مگر اندازہ بہرحال لگا رہی تھی کہ یہ زلزلہ وہی زلزلہ ہے جو عذاب کی ایک قسم ہے' جس سے پناہ مانگی جاتی ہے۔ وہ زیر لب دعائیں پڑھنے لگی۔ اس نے اپنے بالوں اور چہرے کو بھی جھاڑا تھا۔ اسے یقین تھا کہ سعد اللہ جلد پہنچ جائیں گے لیکن یونہی خیال آیا اگر سعد اللہ بھی کسی ایسی صورت حال میں پھنس گئے ہوں یا اللہ۔۔۔ اچھا تو پھر اس کا اپنا بھائی۔ یا پھر پڑوسی۔

لیکن سوال تو وہی آگیا کہ اگر وہ سب بھی تو۔۔۔ تو اے وزیرہ احمق تمہیں سعد اللہ کے بجائے اللہ کو پکارنا چاہیے۔ ہاں۔ سوری اللہ۔ مجھے معاف کر دیجیے مجھ سے غلطی ہو گئی آپ مجھے اس مصیبت سے نکالیے۔

وہ رونے لگی اور اب یہ رونا بند نہیں ہو رہا تھا۔ اسی رونے اور خوف کے درمیان اس نے علی کو دیکھا۔ جو حیرت سے اپنے گھر کو دیکھ رہا تھا اور پھر شدید اچنبھے سے اس جھری کے نزدیک آگیا۔ جہاں سے ماں کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔

"ہمارا گھر کس نے توڑا؟" وہ ماں اور بھائی دونوں سے پوچھ رہا تھا۔ ہاتھ میں فیڈر مگر بہت رعب اور غصہ۔

"اللہ نے۔" وزیرہ کے رونے میں شدت آگئی۔

"اللہ گھر توڑ بھی دیتے ہیں۔" ولی حیران تھا۔

"ہاں' غصے میں آجاتے ہیں تو توڑ دیتے ہیں۔" وزیرہ بڑبڑائی تھی۔

"اللہ تعالیٰ غصے میں ہیں۔" علی نے حیرت سے بھائی کو دیکھا۔ ولی نے بڑے پن سے تصدیق کی۔ دونوں بھائیوں کے لیے گھر کی ہیئت کدائی دلچسپی کا باعث بن گئی۔ وہ ماں کا حال بھول کر گھر میں بے فکری سے گھومنے لگے۔ وزیرہ سر جھکا کر رونے لگی پھر آنسو پونچھ کر دعائیں مانگنے لگی۔ معافی مانگنے لگی۔ یا اللہ خیر۔ سعد اللہ اسے فون تو کریں۔ یا پھر یہ کہ وہ ہیں ہی بے خبر کہ ادھر گھر میں کیا ہو گیا۔ اے اللہ سعد اللہ کو بھیج دے۔ ارے نہیں اللہ بس تو مدد کر دے۔ تیرا شکر کہ اتنی بڑی تباہی میں بھی تو نے مجھے خراش بھی نہ آنے دی اور میری بچوں کو محفوظ رکھا اور اس قابل رکھا کہ میں نے بچوں کو کھانا کھلا دیا۔ ورنہ میری بھوکے بچے۔ اے اللہ! مجھے اس مشکل سے تو ہی نکالے گا۔

وہ سوچوں کے عجیب مرحلے پر تھی۔ کبھی منفی ہوتی کہ مثبت۔

پتا نہیں کتنا وقت بیتا۔ بچوں کی مگن آوازیں اس کی طمانیت کا باعث تھیں۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ جب

اللہ نے اسے اتنا بچا لیا تو آگے بھی خیر ہوگی مگر اسے ایک بار پھر دیواریں ملنے کا گمان ہوا اور سامنے والے کونے سے پلستر جھڑ کر نیچے گر گیا۔ یہ آفٹر شاکس تھے۔ وہ پہلی بار بری طرح خوف زدہ ہو گئی۔

"علی! ولی! تم دونوں باہر لان میں چلے جاؤ۔ لان میں کھیلو۔۔۔"

مگر بچوں نے منع کر دیا۔۔۔ اندرونی دروازہ بند تھا۔ وہ نہیں کھول سکتا۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ کرسی رکھ کے اوپر چڑھا اور دروازہ کھول لیا۔

"لان میں کھیلنا علی۔۔۔!" وہ جھری سے چلائی۔

"نہیں مما! ہم دیکھیں گے اللہ تعالیٰ اور کن کن لوگوں پر غصہ ہیں کہ گھر توڑ دیتے ہیں۔" وہ بڑے پن سے کہتا باہر کو لپکا اور علی بھی اس کے پیچھے تھا۔ وزیرہ چلانے لگی۔

"گھر سے باہر نہ نکلنا علی۔۔۔ ولی گھر کے اندر آؤ۔"

مگر بچے باہر جا چکے تھے اور ان کی آوازیں معدوم ہو گئیں۔ وزیرہ نے دھاڑیں مار مار کے رونا شروع کر دیا۔ وہ بھاگ کر کھڑکی تک آئی اور پوری طاقت سے چلائی۔

"علی۔۔۔ ولی! باہر مت نکلنا۔"

وزیرہ کی زندگی کے قیامت کے پل تب شروع ہوئے۔ وہموں' خدشوں کا آغاز۔ انہیں اس علاقے میں آئے ابھی مہینہ بھی نہیں ہوا تھا اور اس کے بچے اپنے دروازے کی پہچان تک نہیں رکھتے اور وہ گھر سے باہر نکل چکے تھے اور واپسی کی راہ۔۔۔

وزیرہ کو پہلی بار خود پر پڑنے والی افتاد کا اندازہ ہوا۔ اس کے دل میں خیال آیا۔ اس نے اپنے بچوں کو آخری بار دیکھا ہے بس۔۔۔ وہ حلق کے بل چلانے لگی۔

"علی۔۔۔ ولی کوئی ہے جو میری آواز سنے اور علی ولی کو روک دے۔ پکڑے۔۔۔ آپ کہاں ہیں سعد اللہ۔۔۔ امی! بابا! بھائی۔۔۔! ارے اللہ۔۔۔ اللہ! میرے بچوں کی حفاظت فرما۔"

اس کے پیٹ میں گرہیں پڑنے لگیں۔ وہ کبھی اوپر والی جھری سے آواز لگاتی کبھی نیچے بیٹھ کر صدائیں دیتی۔ کبھی چھوٹی سی کھڑکی کے پاس آجاتی اور پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر انہیں پکارتی۔ بچوں کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ اس کا سسرالی محلہ ہوتا تو دس چاچے تائے بچوں کو سمیٹ لیتے۔

بابا کا گھر ہوتا تو سب جانتے۔ یہ وزیرہ سعد اللہ کے بیٹے ہیں۔ مگر یہاں تو ابھی تک کسی کو خبر نہیں تھی کہ یہ بچے کس کے ہیں۔

"اے اللہ مدد بھیج!" وہ رو رو اور چلا چلا کر ادھ موئی ہو گئی۔

ہر گزرتا پل اسے بچوں سے دور کر رہا تھا۔ نئی نئی کالونی میں ساتھ کے دو گھر خالی تھے۔ سامنے میدان تھا اور گھر دوسرے گھر سے دور تھے کچھ خالی پلاٹ اور وہاں روڈ کے اختتام پر گندا نالا۔۔۔

جیسے جیسے اس کے خدشات میں اضافہ ہوتا' وہ چیخیں مارنے لگتی۔ جسم کی پوری طاقت لگا کر انہیں پکارتی۔

اس علاقے کی خاموشی جو سکون بخش لگتی تھی۔ اسے اب موت کا سناٹا لگ رہی تھی۔ بچے عام حالات میں گھر سے نکلتے تو شاید وہ اتنی پاگل نہ ہوتی مگر اس طرح اس صورت حال کو عام حالات میں سمجھنا بہت مشکل تھا۔ لیکن وزیرہ جس مصیبت میں تھی۔ اس کا چیخنا چلانا بے دم ہونا سب فطری تھا۔ دفعتاً" گاڑی گزرنے کی آواز سنائی دی' پھر کہیں دور ایمبولنس کا ہوٹر بجا تھا۔ اور پھر اسے محسوس ہوا کہ دو تین گاڑیوں کے ایک ساتھ بجتے ہوٹر تھے۔ اس کے دل میں شدت سے برے برے خیال ابھرے۔ وہ پاگلوں کی طرح ذرا سی جگہ پر بھاگنے لگی۔ وہ راستہ بنانے کی کوشش کرنا چاہتی تھی اور یہ وہ اینٹیں تھیں' جنہیں ڈرل کیا جاتا تھا۔ یا کئی مزدوروں نے اٹھانا تھا۔

وہ یہ جانتی تھی کہ وہ کچھ نہیں کر سکے گی مگر پوری جان لگا کر بلاوجہ کی محنت کر رہی تھی۔ چھوٹے سائز کے کچھ پتھر ادھر کر دیے کچھ ادھر۔ پھر اٹھا کر مارنے لگی۔ ہانپنے لگی۔ اپنے بال نوچنے لگی۔ سینہ کوبی

کرنے لگی۔

کاش بچے اس کے ساتھ اندر ہی ہوتے اور اس نے ان سے کیوں کہا کہ وہ لان میں جائیں۔ جانتے بوجھتے کہ دونوں کو گھر سے باہر نکلنے کا کتنا شوق تھا۔ لیکن اس نے تو اس لیے کہا تھا کہ آتش شاں سے کوئی اور چھت دیوار گرتی تو وہ خدانخواستہ نہ کچلے جاتے۔ لان میں کم از کم ایسا تو نہ ہوتا۔

لیکن وہ کہاں چلے گئے میرے بچے... میرے اللہ! مجھے نکال دے ادھر سے... نہیں بلکہ میرے بچوں کو کچھ نہ کرنا اور علی نے صرف فیڈر پی رکھا ہے۔ اللہ اسے تیز بھوک لگنے لگے اور وہ گھر لوٹ آئیں۔ مگر انہیں تو ابھی گھر کے دروازے کی بھی پہچان نہیں... گھر کے ارد گرد ہوتے تو اب تک آچکے تھے۔

علی اتنی دیر بھوکا نہیں رہ سکتا۔ ہائے کہیں نالے میں تو نہیں گر گئے یا کوئی انہیں پکڑ کر لے گیا ہو۔ یا اللہ میں کیا کروں۔

وہ ہار کر بیٹھی۔ ایک بار پھر اٹھی۔ مسالا پیسنے والی ڈنڈے سے دیوار پر ٹھوکریں مارنے لگی۔ چمچوں سے جیسے راستہ کھودنے لگی۔ دونوں ہاتھوں سے دیواروں کو مارنے لگی۔ کبھی ایک دیوار کی جانب جاتی... کبھی دوسری ڈھیری کے پاس۔

اس کے دل کو یقین ہو گیا تھا کہ اس کے بچے گم ہو چکے ہیں یا گندے نالے میں آ گئے۔ اسے صرف اپنی پڑی تھی۔ اسے قطعاً" خبر نہیں تھی کہ پورے ملک پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی اور مائیں اپنے سامنے اپنے جگر گوشوں کو مرتا دیکھ رہی تھیں۔ قیامت صغریٰ بپا تھی۔ ایک دیوار سے دوسری دیوار کرتی نجانے کب وہ کہیں گر پڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

اسے ہوش آ گیا تھا۔ وہ بخیر تھی۔ اسپتال کا صاف ستھرا بیڈ۔ اس کے دائیں بائیں ماں باپ بھائی اور سعد اللہ تھے اور عین سامنے ہنستے مسکراتے علی... اور ولی۔

لیکن وہ خوش ہونے کے بجائے ہسٹریائی ہونے لگی۔ اس کے بچے سامنے تھے مگر وہ چلائے جاتی تھی کہ وہ گم ہو گئے ہیں... وہ دونوں گندے نالے میں گر گئے تھے۔ اسے جسمانی چوٹیں نہیں آئی تھیں... ہاں بہت جنون کے عالم میں مٹی کھودنے سے پتھر اٹھانے سے انگلیاں فگار تھیں۔ مگر وہ شدید ذہنی صدمے کا شکار ہو چکی تھی۔ اور یہ بہت خطرناک صورت حال تھی۔ بچے اس کی گود میں ہی بٹھائے گئے... بچے اسے پکارتے سب اسے یقین دلاتے مگر وہ بس چلاتی۔ کمرے کے بند دروازے سے خوف کھاتی چھت دیکھ کر حواس باختہ ہو جاتی۔ سوتے سے اٹھ کر کھلے میں چلی جاتی۔ اونچی اونچی آواز سے علی اور ولی کو پکارتی اور بالکل اسی انداز سے چلاتی' التجائیں کرتی جیسے زلزلے کے اس روز کرتی تھی۔

ماہر نفسیات نے مرض قابل علاج قرار دیا مگر بہت دھیرے دھیرے صبر آزما۔

اور یہاں کسی کو جلدی نہیں تھی۔ وزیرہ کے ذہن پر ان چند گھنٹوں نے قبضہ جما لیا تھا۔ ہر جانب سے اس کے لیے توجہ تھی' محبت تھی' اسے جتایا گیا کہ وہ اور اس کے بچے معجزاتی طور پر بچ گئے۔ ہر لحاظ سے ٹھیک ٹھاک ہیں جبکہ کتنی مائیں خالی گود لیے بیٹھی تھیں۔ کتنے بچے گودوں کو ترس رہے تھے۔ وزیرہ نرم دل تھی۔ حقیقت پسند تھی۔ اسے خود پر اللہ کی کرم نوازی کا اندازہ تھا۔ مگر ذہن سے وہ اندوہناک صبح سرکتی نہ تھی۔ مگر صدمہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو انسان زندگی کے جھمیلوں میں پڑ کر مگن ہو ہی جاتا ہے۔ وقت ذرا زیادہ لگا مگر اسے بھی حقیقت حال میں لوٹنا پڑا۔ جہاں اس کی خوشگوار زندگی تھی۔ سب اچھا تھا۔

بظاہر سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ مگر وزیرہ سعد اللہ بہت وہمی ہو گئی۔ اسے ہر پل لگتا اس کے بچوں کے ساتھ کچھ برا ہو جائے گا۔ وہ ہر چیز سے خوف کھاتی۔

اس نئی زندگی اور سوچ میں وہ تنہا تھی۔ اس لیے کہ کچھ سننے کو تیار نہ تھی۔ بس جو دل میں سما گیا' وہی درست ہے۔ کسی کی کہی پر یقین نہ کرتی۔ سائے کی طرح ساتھ رہتی۔ کھانسی کو کالی کھانسی تک سوچ لیتی۔ پھوڑا

پھنسی کینسر لگتا۔ خارش کو خطرناک الرجی تک لے جاتی۔ ہر بخار' ڈینگی' ملیریا اور ایبولا لگتا۔ ملازمین پر بھروسا نہ کرتی۔ اس واقعہ کے بعد سے وہ بچوں کے کمرے میں سوتی تھی۔ وہ ان سے یوں چپکی رہتی جیسے گوند ہو۔ انہیں واش روم کا دروازہ نہ بند کرنے کی سخت ہدایت تھی۔ اس نے لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ بچوں کو ہر تفریح گھر میں دیتی اور بچوں کو چڑ جانے پر رونے لگتی۔

رشتے داروں سے ملنا جلنا بند کر دیا کہ ان کے بچے جب کھیل ہی کھیل میں لڑ پڑتے تو یہ چیل کی طرح بچوں کو جھپٹ لیتی۔ اپنے بچوں کی غلطی تو سنتی ہی نہیں تھی۔ دوسروں سے لڑنے لگتی۔ وہ ایک دائرے میں قید ہوتی جا رہی تھی مگر یہ قید اسے پسند تھی۔

اسے خبطی کہا جانے لگا۔ وہ خود بھی چاہتی کہ اتنی شدت سے باز آجائے مگر اس سوچ پر کبھی عمل درآمد نہ کر سکی' نہ کوئی کروا سکا۔

بچے اسکول جاتے تو گیٹ پر بیٹھ جاتی۔ سعد اللہ نے بمشکل اس امر سے باز رکھا۔ پھر اسے وین ڈرائیور مشکوک لگا۔ پھر اسے نئے وہم نے گھیرا۔ گاڑیوں میں سلنڈر پھٹ جاتے ہیں۔ پھر اس نے سوچا اسکول سے نزدیک ترین گھر لے لیا جائے۔

اس نے بازار جانا چھوڑ دیا تھا۔ جو بھی لائے سعد اللہ ہی لائے۔ یہ جنون خطرناک تھا اور بچے ماں سی بے زار ہونے لگے تھے۔ وانیہ کی پیدائش نے کافی بہتری پیدا کی مگر بالکل صراط مستقیم والی بات نہیں تھی۔

وانیہ ایک پیدائشی کمزور بچی تھی۔ جو ماں کی پوری توجہ چاہتی تھی۔ پہلے وہ وہم میں جی کر پریشان ہوتی تھی۔ اب وانیہ ایک حقیقی پریشانی تھی۔ جس نے اس کا دھیان فالتو کی سوچوں سے ہٹا دیا۔

سعد اللہ وانیہ کو سچ مچ رحمت کہتے تھے جس نے آ کر ان کی زندگی کو دوبارہ سے اعتدال کی راہ پر ڈالا۔ وانیہ سے پہلے کی جنونی کیفیت تو ختم ہو گئی۔ مگر اب اس کے اپنے اصول و ضوابط تھے۔

☼ ☼ ☼

سب شکر ادا کرتے کہ وہ نو سال پہلے والی حالت سے ابھر چکی تھی۔ ایک خوشگوار زندگی... الحمدللہ... مگر ابھی پشمینہ اور فائزہ اعتراض اٹھائے بیٹھی تھیں۔

وزیرہ نے کہہ دیا تھا۔ وہ صبح دس بجے کے قریب گھر سے نکلیں گی اور ڈھائی بجے گھر کے اندر ہونا ہو گا۔ کیونکہ دو بج کر پینتیس منٹ پر بچے آجاتے ہیں۔ آپا گل خاموش رہی تھیں جبکہ پشمینہ کا کہنا تھا کہ دو بجے کے بعد ہی تو شاپنگ شروع کی جاتی ہے اور وہ گھر واپس آجائیں۔ ایسے میں شاپنگ مکمل ہی نہ ہو پائے گی۔

وزیرہ نے تسلی دی سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گا۔

دونوں کے درمیان بحث ہو گئی۔ پشمینہ کا کہنا تھا کہ بچے اب اتنے چھوٹے نہیں ہیں۔ چودہ اور پندرہ برس کے علی اور ولی اور سات برس کی وانیہ... دونوں بڑے بھائی بڑے آرام سے گھر میں رہ سکتے ہیں اور بہن کو بھی سنبھال سکتے ہیں۔ گھر سے محفوظ جگہ کون سی۔

وزیرہ کا جواب انکار تھا۔ وہ کسی بڑے کی موجودگی کے بغیر بچوں کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔

"بچے اب بڑے ہو چکے ہیں بھابھی گل!" پشمینہ نے کہا۔ "اور اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جانے میں تو امان ہی امان ہے۔"

"نہیں... وہ اکیلے ہوں گے۔ میں انہیں اکیلا چھوڑ ہی نہیں سکتی۔ سو خطرے..."

"کیسے خطرے بھابھی گل..."

"ایک تو یہ شرارتی بہت ہیں۔" (یہ سراسر الزام تھا۔ وہ انہیں کھیلنے بھی نہ دیتی تھی کہ چوٹ لگے گی۔ یہ ہو گا اور وہ ہو گا۔ بس چلتا تو اسٹیچو بنا کر بٹھا دیتی)

"تکیوں سے لڑتے ہیں۔ ریسلنگ کا شوق ہے۔ ایک دوسرے کو پنچ مارتے ہیں اور یہ وانیہ بلاوجہ جا کر ان کی ٹانگوں میں گھستی ہے۔"

"وہ تو کھیلتی ہے وزیرے...!" آپا گل نے رسانیت سے کہا۔

"نہیں آپا گل! دھکا لگتا ہے۔ ایک بار تو میز کا کونا لگ گیا۔"

"اچھا تو ہم انہیں کہہ دیں گے۔ اسکول سے آ کر

کھانا کھالیں اور آرام سے ٹی وی لگا کر دیکھیں۔ یا سو جائیں۔"

"نہیں نہیں۔۔۔ اگر شارٹ سرکٹ ہو گیا اور ایک بار تو یو پی ایس میں آگ کے شعلے بھڑک اٹھے تھے تو یہ۔۔۔"

"اور آج کل تو اندھیرا ہی ہوتا ہے گیس لیمپ جلا لیں گے موم بتی۔" فائزہ نے آرام سے کہا۔

"ارے نہیں۔۔۔!" وزیرہ کا رنگ سفید ہو گیا۔ "اگر جل گئے۔ موم بتی تو اکثر گر جاتی ہے اور کارپٹ آگ پکڑ لیتے ہیں۔"

"اللہ نہ کرے۔" پشمینہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"اپنی حفاظت تو انسان کے اندر خود ہوتی ہے۔ اللہ بچاتا ہے انسان کو۔۔۔ موت خود زندگی کی حفاظت کرتی ہے۔ ہم وقت کو ٹال نہیں سکتے بھابھی۔۔۔!"

"کیسی باتیں کر رہی ہو۔ اچھے لفظ بولو پشمینہ۔۔۔" وزیرے کا رنگ پھر اڑا۔

"وہ لڑکے ہیں۔ تم انہیں باندھ کر نہیں رکھ سکتیں وزیرے۔۔۔!"

"میں باندھتی تو نہیں ہوں۔ بس میں ان کے سامنے رہوں۔ وہ اکیلے نہ ہوں۔" وزیرے نے انگلیاں ملنی شروع کر دیں۔ وہ اس چیز کو سمجھتی تھی۔ مگر اپنے آگے بے بس تھی۔

بچے چڑتے تھے۔ سعد اللہ کہتے۔ "وہ بڑے ہو رہے ہیں۔ ان کی اپنی پرائیویسی ہو گی ایسے تو تم انہیں مفلوج کر دو گی۔ مردانگی ختم کر دو گی۔ عورت بن جائیں گے گھر کے اندر رہ رہ کر۔" وزیرہ رونا شروع کر دیتی۔

اسے سب سمجھ تھی مگر وہ مجبور تھی۔

"پتا ہے سعد اللہ کے دوست کے گھر کا چلتا پنکھا گر گیا۔ بچے کے بازو کا پورا گوشت پھٹ گیا۔" اس نے یاد آنے پر بتانا ضروری سمجھا۔

فائزہ ہنسی۔ "اتنی سردی میں پنکھا کون چلائے گا مامی جان۔۔۔؟"

"اور اگر پنکھا گرنا ہی ہو گا تو آپ کیسے روکیں گی؟" پشمینہ نے نکتہ اٹھایا۔

"روک تو نہیں سکتی۔" وزیرہ نے اس بات پر بہت سوچا تھا۔ "مگر میں فرسٹ ایڈ تو دے سکتی ہوں۔"

"پنکھا تم پر بھی گر سکتا ہے خدانا خواستہ۔۔۔!" آپا گل کو اس کے چہرے پر پھیلے خوف پر ترس آنے لگا تھا۔

"ہاں آپا گل۔۔۔!" وہ تیزی سے سیدھی ہوئی۔ "مجھ پر گر جائے مگر۔۔۔" وہ رونے لگی۔ آگے بولا ہی نہ گیا۔ ہچکیاں بندھ گئیں۔ تینوں اس کے نزدیک سرک آئیں۔

"اللہ پر بھروسا کیوں نہیں کرتیں۔"

"کرتی ہوں۔۔۔ مگر۔" وہ بمشکل بول پا رہی تھی۔ آپا گل نے وزیرے کو خود سے چپکا لیا۔

"اچھا اب رونے کی ضرورت نہیں۔ ابھی طے کر لیتے ہیں۔ جن چیزوں میں میرا جانا ضروری نہیں ہو گا۔ اس میں میں نہیں جاؤں گی اور تم لوگ پورا دن بے فکر ہو کر شاپنگ کرنا۔ میں گھر میں رہوں گی پورا دن بچوں کے ساتھ۔"

"ٹھیک ہے' باقی دن یاد رہے۔ دو بج کر تیس منٹ پر گھر کے اندر کیو تک۔ دو بج کر پینتیس منٹ پہ۔۔۔" پشمینہ نے فائزہ کو دیکھا۔

"بچے آجاتے ہیں۔" فائزہ نے ہنس کر جملہ مکمل کیا۔

"ویسے مامی جان! مجھے تو حیرت اس بات پر ہے کہ آپ اسکول تک کیسے بھیج دیتی ہیں۔ بچے تقریباً" نو گھنٹے دور رہتے ہیں آپ کی نظروں سے۔ تب نہیں آپ کا دل ہولتا۔"

وزیرہ آنکھیں پونچھتے پونچھتے چونکی پھر ذرا حیرت سے فائزہ کو دیکھا' جیسے فائزہ کو بے وقوف سمجھا۔

"اسکول میں کیا فکر۔۔۔ وہاں تو اتنے لوگ ہوتے ہیں۔ چوکیدار ہوتا ہے۔ ٹیچرز ہوتے ہیں اور اتنے سارے بچے۔۔۔ وہاں کوئی اکیلے تھوڑی ہوتے ہیں چار دیواری میں محفوظ ہوتے ہیں۔ میں نے تو پرائیویٹ گاڑی لگوا رکھی ہے صرف ہمارے تین بچوں کو چھوڑتی' لیتی ہے اور اگر کبھی دیر سویر ہو جائے یا گاڑی ٹریفک

میں پھنس کر لیٹ ہو جائے یا سو اور مسئلے۔۔۔ ہم نے چوکیدار سے کہہ دیا ہے' آندھی آئے طوفان آئے۔ کچھ بھی ہو۔ بچے اسکول کے اندر رہیں گے اور بچوں کو بھی کہہ رکھا ہے۔ بڑی سے بڑی مصیبت ہو۔ گیٹ سے باہر قدم نہیں رکھنا۔ اسکول میں کیا فکر' مجھے تو بس یہ ہے بچے اکیلے نہ ہوں' بس سب کی نظروں کے سامنے رہیں۔"

وہ بہت یقین سے تیز تیز بولنے لگی تھی۔ فائزہ نے دونوں ہاتھ سامنے کھڑے کر کے مزید بولنے سے باز رکھا۔

"ہمیں یقین آگیا مامی۔۔۔ بالکل آگیا۔ وہی ہو گا جو آپ چاہیں گی۔ آپ کا گھر ہے جیسے آپ کہیں گی ہم ویسے ہی رہیں گے ویسے ہی کریں گے۔ جس دن موود نے جانا ہو گا میں گھر پر رکوں گی۔ کوئی نہ کوئی گھر پر رہے گا ورنہ ڈھائی بجے سے پہلے واپسی پتھر پر لکیر ہے ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" وزیرہ مسکرائی۔ "مجھے کوئی بہت ضروری کام کرنا ہو' جانا آنا ہو میں سب اس طرح سے سیٹ کرتی ہوں کہ بچوں کے ساتھ ہی تقریباً" نکل جاتی ہوں اور ان کے آنے سے پہلے لوٹ آتی ہوں فکر ہی نہیں ہوتی۔"

آپا گل اور پشمینہ مسکرائیں۔

وزیرہ نے زندگی ایسے ہی گزارنی تھی۔ اسے سمجھایا نہیں جا سکتا تھا۔

"اور تم کون سی اتنی بڑی ہو جو انہیں سنبھال لو گی۔ الٹا وہ تمہیں درست کر دیں گے۔" وزیرہ اب ہلکی پھلکی تھی۔ فائزہ کو دیکھ کر مسکرائی۔ فائزہ سولہ برس کی تھی۔ دبلی پتلی لمبی۔۔۔ علی ولی سے سال بھر ہی بڑی تھی۔ مگر جبرا" خود کو آپا گل کہلواتی۔ علی ولی یہ موٹے اور لمبے۔

"ایسے کیسے درست کر دیں گے۔ ہاتھ میں ڈنڈی پکڑوں گی اور زیادہ تنگ کیا تو رسی سے باندھ دوں گی۔ آپ کے آنے تک ایک ہی جگہ بیٹھے رہیں گے۔"

اس نے حل سوچ رکھا تھا جبکہ وزیرہ کی آنکھیں ابل پڑیں اور سانس خشک ہو گیا۔

"ارے۔۔۔ ایسا نہ کرنا۔ تم ادھر ادھر ہو گئیں اور وہ بندھے ہی رہ گئے اور کچھ ہو گیا۔ بجلی چلی گئی یا آگ لگ گئی یا۔۔۔؟"

"ارے۔۔۔ ارے وزیرے۔۔۔ ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ مذاق کر رہی ہے بے وقوف۔۔۔!" آپا گل اور پشمینہ پریشان ہو گئیں۔ فائزہ بھی خجل ہو گئی۔

"نہیں ناں آپا گل! باندھنے سے تو وہ ہل ہی نہیں سکیں گے ناں تو۔۔۔" وہ بچوں کی طرح ہراساں ہو رہی تھی۔

آپا گل اور پشمینہ نے فائزہ کو دیکھا اور وزیرے کی تشفی کرانے لگیں۔ جس کی سوچ کی سوئی اٹک گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

پھر آج پتا لگا ہم نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر سکتے کہ ہم نعمتوں کا ادراک ہی نہیں رکھتے۔ فرزانوں کو کیا خبر کہ دیوانے کس عیش میں جیتے ہیں۔

کیسا لطف ہے دیوانگی میں۔۔۔ جب وہ ہوش کھو دیتا ہے۔ سوچ و فہم سے ماورا ہو جاتا ہے۔

تو ہوش و خرد کو چھوڑ دینا بھی ایک نعمت ہے کہ پتا ہی نہیں کیا قیامت ٹوٹی۔ کیوں کیسے کب سارے سوال بے معنی رہ جاتے ہیں کہ ہم ہوش میں نہیں اور سعد اللہ اس خبر کے بعد ایسی بے خبری کی نعمت سے مالا مال ہو گئے تھے۔ مرد ہو کر اتنی کم ہمتی۔۔۔ کہ سنا' سمجھے اور ڈھے گئے۔

ہاتھ جھاڑے۔۔۔ جان چھوٹی۔

مگر وہ جس کے بارے میں گمان تھا کہ اس کا دل بند ہو جائے گا۔ وہ آگاہی کے عذاب میں مبتلا کر دی گئی تھی۔ ہوش و خرد تو اس کا گنوا دینا بنتا تھا۔ دیوانوں کی طرح سر پر خاک ڈال کر در در گھومنا تو اب اس کا مقدر تھا۔ مگر وہ ہوش مندی سے کھڑی تھی اور ایسے ایسے سوال کرتی تھی کہ کسی دانا کے پاس جواب نہ تھا۔

وہ ہاتھ جوڑتی' روتی پیٹتی ہر ایک کے آگے جاتی تھی۔

سوال دہراتی تھی۔ جواب چاہتی تھی۔ مگر سال سب کی زبانیں گنگ تھیں۔ کسی کے پاس جواب نہ تھا اور یہ کوئی اتنے مشکل سوال بھی نہیں تھے۔ سیدھے سادھے عام فہم سے سوال۔۔۔

مگر پتا نہیں یہ لوگ۔۔۔ اور سارے لوگ یہ ساری دنیا آنکھ چراتی تھی۔ جواب دینا نہیں چاہتی تھی یا ان سب کے پاس جواب تھے ہی نہیں۔

"کیسے مر گئے۔۔۔ میں نے تو اسکول بھیجے تھے۔" اس نے ایک ریسکیو ورکر کا گریبان پکڑ کے پوچھا۔ "میں نے تو پڑھنے بھیجے تھے۔ میں نے تو۔۔۔"

ایک میڈیا رپورٹر نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور بھاگتے ہوئے اپنا مائیک اس کے منہ کے نزدیک کر دیا۔ اس نے رپورٹر کے دونوں ہاتھ مائیک سمیت پکڑ لیے۔

"اسکول کی تو دیواریں اونچی تھیں ناں۔۔۔ اندر بہت سے لوگ تھے۔ دروازے پر چوکیدار تھا۔ پھر کیسے مر گئے۔

میں نے گھر سے زیادہ بھروسا کیا تھا اسکول پر۔۔۔ میں نے تو پڑھنے کے لیے بھیجا تھا۔ اسکول بھیج کر میں سکون سے سو جاتی تھی۔۔۔ بے فکر۔۔۔

ہر آنے والے کو جانا ہے۔۔۔ میں جانتی ہوں۔۔۔ مگر ایسے زبردستی کوئی کیسے بھیج سکتا ہے۔

ظالمو! قبروں پر جو پھولوں کی چادریں چڑھتی ہیں ان میں بھی پورے کھلے پھول پروتے ہیں۔ تم نے کلیاں مٹی میں مل دیں۔

اور ماؤں کو لاڈ کرنا سکھایا نہیں جاتا۔ بس وہ بولنا شروع کرتی ہیں اور ہونٹوں سے محبت جھڑنا شروع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ماؤں کو بین کرنے کی تربیت بھی نہیں دی جاتی۔ مگر جب اپنی کوکھ سے جنے کے مرنے کی خبر سنتی ہیں تو بس بولنا شروع کر دیتی ہیں۔ پھر عرش بھی ہلتا ہے اور فرش بھی۔ کم فہم کم آمیز مائیں ایسے ایسے شاہکار جملے کہتی ہیں کہ بڑے بڑے علم دان دانتوں میں انگلیاں ڈال لیں، سر پر خاک ڈالیں اور کسی ایسی جگہ جا چھپیں جہاں کچھ سنائی نہ دے۔ یہ تو ایک ماں کا ماتم تھا کہ جب میں نے بچے اسکول بھیجے۔ جب 132 مائیں یک زبان کرلائیں۔۔۔ پچھتائیں اور چلائیں۔ اس صبح صرف وزیر اللہ سعد کی کوکھ تو نہیں اجڑی تھی اسکول کے حملے نے 132 ماؤں کو زندگی بھر کے دکھ اور پچھتاوے میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں نے بچہ اسکول بھیجا تھا۔ وہ اپنا منہ سر پیٹتی ہیں، ہائے کیوں بھیجا تھا۔

اور ہوش میں آنے کے بعد سعد اللہ کا صبر و ضبط کمال کا تھا۔ انہوں نے کیمرا کے سامنے آکر اپنے بچوں کی شہادت پر فخر کیا تھا اور انہیں ملک و قوم پہ وار دیا تھا۔ مگر بعد میں تنہا ہونے پر انہوں نے سوچا اور زندگی بھر سوچیں گے۔

تحفہ تو دل کی خوشی سے بصد احترام دیا جاتا ہے ایسے جبراً "لے لیے جانے کو بھی کیا تحفہ کہتے ہیں۔

اور وزیرہ سعد اللہ ننھی وانیہ کے سوال پر کہ بھائی کہاں چلے گئے۔ خالی آنکھوں سے دیکھتی ہے۔ بچی بہت دیر انتظار کے بعد سوال دہراتی ہے۔ تب اس کا منہ سے یہی نکلتا ہے۔

"میں نے تو اسکول بھیجے تھے۔"

اور یہ صرف وزیرہ سعد اللہ کی خود کلامی بے فکری یقین اور پچھتاوا تو نہیں تھا۔ پتا نہیں کتنی مائیں جن کے بین تکیوں اور رضائیوں کے اندر گھٹ گھٹ گئے۔

☆ ☆

سرورق کی شخصیت

ماڈل	عروہ
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافر	موسیٰ رضا